اقبالیاتی ادب

علمی مجلّات کے مقالات کا تعارف

نبیلہ شیخ

ڈاکٹر شاہد کامران: ''دانش افرنگ، اشتراکیت اور اقبال'' الاقربا، اسلام آباد، جولائی-ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۳۸-۵۹

مغرب سے متعلق اقبال کے طرزِ فکر میں دو نمایاں رجحان نظر آتے ہیں۔ اول: اقبال مغربی علوم وفنون اور خصوصاً طبعی علوم میں مغرب کی حیرت انگیز ترقیات کو سراہتے ہیں۔ دوم: انھوں نے فکرِ غرب سے ذاتی سطح پر استفادہ کیا، تاہم اقبال غیر ملکی زبان وادب، تاریخ اور تہذیب کے یک طرفہ مطالعات کے نقصانات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ نوجوانوں کو اسلامی تہذیب وتمدن کے عقلی پس منظر کے بغیر محض مغربی تعلیم دینے کے خلاف نظر آتے ہیں۔ ان کی مخالفت کی وجہ جدید مغربی تہذیب وتمدن کی بے راہ روی ہے، جو روحانیت سے انکار سے جنم لیتی ہے۔ وہ اشتراکی تحریک کو بھی مغربی تمدن وسیاست کے خلاف ایک ردّعمل خیال کرتے ہیں۔ قیصر وکلیسا کی مذمت، مزدور وکسان کی عظمت اور محنت کو ایک معاشی قدر قرار دینے سے اقبال خود کو اشتراکی ثابت نہیں کرتا۔ تاہم اشتراکیت کا بطور ایک سیاسی ومعاشی تحریک کے مطالعہ، اقبال کا ایک اہم اور دل چسپ موضوع رہا ہے۔ اقبال مجموعی طور پر اشتراکیت وملوکیت دونوں سے متعدد وجوہ کی بنا پر مایوس نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی: ''فکرِ اقبال میں اجتہاد کی اہمیت'' تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ، جولائی ۲۰۰۶ء، ص ۷۴-۹۳

علامہ اقبال نے اپنے وقت میں فقہی جمود پر تنقید کی اور اجتہاد پر زور دیا۔ وہ ابتدا ہی سے معاشرے میں اصلاحِ تمدن کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ اور ان کے خیال کے مطابق اصلاحِ تمدن اُسی وقت ممکن ہے جب فقہ اسلامی میں اصلاح کی جائے۔

اقبال کے نزدیک فقہ اسلامی کی تدوین جدید عہد حاضر کی اہم ترین ضرورت تھی۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسلام کائنات کے بارے میں حرکی (Dynamic) نظریہ پیش کرتا ہے۔ علمائے متقدمین کی طرح علامہ اقبال بھی اجتہاد کے چار بنیادی مآخذ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس کو تسلیم کرتے ہیں۔ اجتہاد کے معاملے میں

آپ نے وسعت نظر کا مظاہرہ کر کے فقہ اسلامی میں قرآن وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے جو انقلابی تعبیریں پیش کیں، اگر عہد حاضر کے علماے دین اور دانش اور حضرات ان کے استدلال سے اتفاق کریں تو یقیناً روشن مستقبل اور فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید کے لیے نئی راہیں کھل سکتی ہیں۔

☆☆☆

ناصر عباس نیر: ''اقبال اور جدیدیت'' اقبال، لاہور، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۷۱-۸۰

ماڈرن ازم اقبال کی معاصر ادبی تحریک تھی۔ اس کا زمانہ ۱۹۱۰ء تا ۱۹۳۰ء ہے، مگر اس کے براہِ راست اثرات اقبال کی شاعری پر نظر نہیں آتے۔ شاید اس لیے کہ ۱۹۱۰ء تک ان کا شعری مائنڈ سیٹ، متشکل ہو چکا تھا۔ اپنے ابتدائی دور میں اقبال کا مغربی ادبیات سے تعلق تقلیدی ہے، انھوں نے کئی مغربی نظموں کو پورے کا پورا اور کہیں ان کے چند مصرعوں کا ترجمہ کیا ہے۔ مگر ۱۹۱۰ء کے بعد ان کی نظر انتخابی ہو جاتی ہے اور جن دنوں ماڈرن ازم کی یہ تحریک زور وشور سے جاری تھی، اقبال مغربی تہذیب پر تنقید کا آغاز کر چکے تھے اور ماڈرن ازم مغربی تہذیب ہی کا مظہر ہے۔ اقبال نے اسلوبی سطح پر تجربہ پسندی اور روایت شکنی کا مظاہرہ ایک خاص مفہوم میں بہر حال کیا ہے۔ روایت کا جتنا گہرا اور وسیع تصور اقبال کا تھا کسی دوسرے اردو شاعر کا مشکل سے ہوگا۔ اقبال کی انفرادیت ناقابل تقلید تو ہے مگر اپنی مشرق روایت میں بہر حال قابل فہم ہے۔

اقبال کی یہ عطا کچھ کم نہیں انھوں نے جدیدیت کو مغربیت سے آزاد کیا۔ اقبال ماڈرنیٹی کو تنقیدی اور انتخابی طور سے قبول کرنے کے حق میں تھے۔ اقبال ماڈرنیٹی کے نکتہ چیں بھی تھے اور مداح بھی۔ اقبال دراصل اپنی اسلامی ثقافتی نہاد کو قائم و برقرار رکھتے ہوئے مغربی جدیدیت سے اخذ واستفادے کے قائل نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد آصف اعوان: ''اقبال کے خطبہ الٰہ آباد کا تہذیبی وتمدنی پس منظر'' اقبال، لاہور، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۵۰-۵۹

خطبہ الٰہ آباد تحریک پاکستان کا ایک درخشاں باب ہے۔ اس خطبے کے بعد مسلمانوں کے سامنے جدوجہد کے لیے ایک واضح منزل کا تعین ہو گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کسی قوم نے دوسری قوم پر فتح حاصل کی تو نہ صرف سیاسی تغلب حاصل کیا، بلکہ سماجی لحاظ سے بھی مفتوح قوم کو نیچا دکھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اقبال جس عہد میں برصغیر میں ایک فلسفی، متکلم اور مصلح قوم کی حیثیت سے سیاسی افق پر ابھرے، وہ فکری پستی، تہذیبی زوال اور معاشی افلاس کا دور تھا۔ اقبال ایک ایسی قوم کا ہادی ورہبر بنا جو اپنے حال سے بیگانہ، ماضی سے بے نیاز اور مستقبل سے بے خبر تھی۔ یہ نہایت قنوطیت اور مایوسی کا دور تھا۔

اکبر الٰہ آبادی کی شاعری ایک زوال آمادہ تہذیب پر دردمندوں کا نوحہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر فکر کے ایسے بیش قیمت موتی رکھتی ہے، جنھیں اقبال کے لفظوں میں ''بیابان کی شب تاریخ میں قندیل رہبانی'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اقبال کے خطبہ الٰہ آباد سے پہلے بھی جغرافیائی علیحدگی سے متعلق بہت سی تجاویز سامنے آچکی تھیں، تاہم اقبال کا الگ وطن کے قیام کا مطالبہ ان کی گہری سوچ اور مجموعی فکری نظام کا حصہ

تھا۔ان کا موقف تھا کہ دین اور سیاست کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔اس سے واضح ہوتا ہے اقبال نے الگ اسلامی ریاست کے قیام کی اصل وجہ اسلامی تہذیبی و تمدنی عوامل کو قرار دیا ہے۔اقبال اسلامی تہذیب کے علمی و ثقافتی ورثے کی تشکیل نو کے خواہاں تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد آصف قادری: ''اقبال کی انقلابی اور مزاحمتی شاعری'' اقبال، لاہور، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۸-۴۹

مزاحمتی ادب کی اصطلاح بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں فرانس میں استعمال ہوئی۔اقبال اصطلاح کے وجود میں آنے سے قبل ہی مزاحمتی شاعری کر رہے تھے۔ان کا انقلابی ذہن فکر و عمل، حرکت و تموج اور حرارت و توانائی کا منبع تھا۔اقبال نے اپنے کلام کے ذریعے ذہنوں میں تعمیر جہان نو کی تمنا کو بیدار کیا۔جب ہم انھیں انقلابی شاعر کہتے ہیں تو اس سے یہ مراد نہیں کہ انھوں نے نعرہ بازی سے کام لیا۔اقبال کو یقین تھا کہ جب انسان میں مزاحمت کا جذبہ بیدار ہو جائے تو وہ ایک تیغ برّاں بن جاتا ہے اور غلامی کی زنجیروں کا کاٹ دیتا ہے۔اقبال نے برطانوی سامراج کے خلاف آواز بلند کی تھی۔طلسم مغرب کو توڑنے کے لیے اقبال نے مزاحمتی نگاہ کو عصائے کلیم بنا کر استعمال کیا۔اقبال شہنشاہیت، غلامی، ملوکیت اور فاشزم کو ابلیسیت بتاتے ہیں۔ابلیسیت کے خلاف مقاومتی لب و لہجے کے غماز مرقومہ اشعار اپنی مثال آپ ہیں۔اقبال ایسی حکومت چاہتے ہیں جو اسلامی اصولوں پر استوار ہو۔جب کبھی عالمی ادب میں ممتاز مزاحمتی شاعروں کی کوئی فہرست مرتب کی جائے گی، اقبال اس میں بلند مقام پائیں گے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد سلیم: ''علامہ اقبال اور ڈاکٹر تاثیر'' تہذیب الاخلاق، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۶-۳۶

ڈاکٹر محمد دین تاثیر ایک کثیر الجہات شخصیت تھے۔شاعر اور سخن فہم، اردو ادب کے اہم نقاد، قدیم و جدید مصوری کے باکمال پارکھ، اردو، انگریزی اور فارسی زبانوں پر حاوی، اچھے مقرر، انتظامی امور میں بے نظیر اور تیزیِ طبع میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔[مقالہ نگار نے ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے اقبال کے ساتھ گزارے گئے وقت کے متعلق چیدہ چیدہ واقعات بھی اس مقالے میں نقل کیے ہیں۔] خواجہ محمد زکریا کا خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر تاثیر علامہ اقبال پر کوئی مربوط کام کر جاتے تو ان کے کام کو سند کی حیثیت حاصل ہو جاتی، لیکن ادبی چھیڑ چھاڑ اور انتظامی ذمہ داریوں نے انھیں جم کر کام کرنے کی مہلت نہ دی۔

☆☆☆

محمد نعیم بزمی: ''اقبال کی خطابیہ اور مکالماتی نظموں میں امیجری'' اقبال، لاہور، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۶۵-۷۵

اقبال کی نظموں کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ اقبال اپنے جوشِ تخیل یا زورِ تخیل سے بعض اوقات مظاہر فطرت کو آپس میں یا انسان کو مظاہر فطرت سے مکالمہ کرتے دکھاتے ہیں۔مکالماتی نظم میں امیجری کے پنپنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے ذریعے یہ محسوس ہوتا ہے کہ خاموش موجودات کو زبان مل گئی ہے۔

دوسرے یہ کہ امیجری میں بصر وصور کے ساتھ ساتھ صوت وتحرک کے اوصاف بھی پیدا ہوجاتے ہیں اور یوں شاعر کے تخیل کی زرخیزی اور نادرہ کاری کے امکانات وقوع میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اقبال نے اپنی خطابیہ نظموں کو گوناگوں امیجز سے سجایا ہے۔ مکالماتی انداز سے امیجری کو جمالیات کی اعلیٰ ترسطح سے روشناس کراتا ہے۔

اقبال کی امیجری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ جب کسی مخصوص امیج کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں تو اس امیج کے ساتھ متضاد نوعیت کے ذیلی امیجز بھی لاتے ہیں، تاکہ پسندیدہ امیج کے خدوخال زیادہ اجاگر ہوسکیں۔ حمام، کبوتر، چکور کے امیجز پس منظر کے طور پر لاکر شاہین کے اوصاف کو نکھارتے اور اس کی درویشی، خودداری، غیرت اور عزت نفس کو اجاگر کرتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر نثار احمد قریشی، ''علامہ اقبال کا مصری مترجم الشیخ الصاوی علی شعلان'' قومی زبان، کراچی، اگست ۲۰۰۶ء، ص ۸۰۔ ۸۴

عربی میں کلام اقبال کے دیگر مترجمین مثلاً ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، شام کے عبدالمعین الملوحی اور حسن ظاظا پر شیخ الصاوی کو یہ فضیلت حاصل تھی کہ ایک تو وہ خود شاعر تھے، علاوہ ازیں ان کے ترجمے کو مصر کی معروف مغنیہ اُم کلثوم نے ترنم میں پیش کیا جس سے عرب دنیا میں اقبال اور ان کے کلام سے آگاہی پیدا ہوئی۔ شیخ الصاوی کا ترجمہ ایسی فصیح وبلیغ عربی میں ہے کہ ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ ایسے تراجم اصل تخلیق کے ہم پلہ ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر وحید عشرت، ''اقبال ایک تحریک'' مخزن، نومبر ۲۰۰۶، لاہور، ص ۱۳۵۔ ۱۴۳

ڈاکٹر محمد اکرم اکرام کی تصنیف اقبال ایک تحریک میں مسلمانوں کو درپیش نئی مبارزتوں کا ادراک ملتا ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ سے اقبال تک اور محمود غزنوی سے قائداعظم تک ایک ہی تحریک روبہ عمل ہے۔ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے فکر وعمل کی ہم آہنگی قران السعدین ہے۔ یہ کتاب اقبال کے فکر وفلسفے کی وضاحت کی اچھی کوشش ہے۔ کتاب کے ایک مقالے بعنوان زندہ رود پر تاریخی اور جغرافیائی نقطۂ نظر سے تبصرہ کیا گیا ہے۔ ایک دوسرے مقالے معراج النبی ﷺ پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کا ایک اور مقالے بعنوان اقبال در راہِ رومیؒ میں اقبال اور رومی کی فکری اور مذہبی اساسیات کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ تبصرہ نگار نے آخری مقالے کو بہت اہم قرار دیا ہے جو ''احیائے علوم'' کے عنوان سے ہے۔ آخر میں تبصرہ نگار نے تجویز پیش کی ہے کہ اقبال نے اپنی جن تحریروں میں علوم کے احیا کی بات کی ہے، انھیں مدوّن کیا جائے کیونکہ یہ وقت کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

شیخ عبدالرشید، علامہ اقبال اور تصوراتِ تاریخ، الشریعہ، گوجرانوالہ، نومبر ۲۰۰۶ء۔ ص ۱۰

علامہ اقبال کا تصورِ تاریخ قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ وہ تاریخ کی غرض وغایت اور تاریخی عمل کو الگ الگ شے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ علامہ کے حوالے سے تاریخ کی تعریف یہ ہے کہ تاریخ ایک طرح کا ضخیم

گراموفون ہے، جس میں قوموں کی صدائیں محفوظ ہیں۔ مختلف مفکرین کے ہاں مختلف تصوراتِ تاریخ ملتے ہیں۔ اقبال کے حوالے سے مطالعہ تاریخ سے ماخوذ تصورات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا یہ کہ زندگی کا مبدا و منبع ایک ہے۔ دوسرا اس امر کا گہرا احساس کہ زمانہ ایک حقیقت ہے لہٰذا زندگی مسلسل اور مستقل حرکت سے عبارت ہے۔ اقبال کے فکر کی اہم ترین جہت حرکت ہے، اس لیے وہ تاریخ کو بھی ایک حرکت ہی تصور کرتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد آصف اعوان: ''نطشے کا نظریہ تکرارِ ابدی اور اقبال'' الشریعہ، گوجرانوالہ، نومبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۲-۲۸

اقبال کی تنقید کے پانچ مراحل ہیں۔

(i) نطشے کا غلط تصورِ توانائی　(ii) زمان کا غلط تصور
(iii) لامتناہیت کا غلط تصور　(iv) نطشے کا تضاد
(v) بدترین تقدیر پرستی

اقبال کے نزدیک خدا تعالیٰ کی تخلیقی توانائی لامحدود ہے، اس لیے تخلیق میں اعادہ ممکن نہیں ہے۔ اقبال کے نزدیک کولھو کے بیل کی طرح ایک شے کا بار بار دہرایا جانا انسانِ کے تصورِ دوام سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔

☆☆☆

محمد ظہیر الدین، ''اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط'' اقبال ریویو، حیدرآباد دکن، اپریل ۲۰۰۶ء، ص ۵-۸

اقبال اکیڈمی حیدرآباد کو حسب ذیل خطوط دست یاب ہوئے ہیں۔ پہلے چار خطوط کی نقول سرکاری مسلوں سے ملیں۔ آخری تین خط، اصل حالت میں آرکائیوز میں محفوظ ہیں۔ ان خطوط کی تواریخ مکتوب الیہان اور موضوعات حسب ذیل ہیں:

۱: ۹/دسمبر ۱۹۲۸ء　(غالباً) بنام رجسٹرار جامعہ عثمانیہ۔ بسلسلہ حیدرآباد خطبات
۲: ۲۱/دسمبر ۱۹۲۸ء　ارباب جامعہ عثمانیہ کے نام بسلسلہ خطبات کے عنوانات
۳: ۲۶/فروری ۱۹۲۹ء　سرامین جنگ کے نام۔ بسلسلہ ادارۂ معارفِ اسلامیہ، لاہور کو امداد
۴: ۳/جنوری ۱۹۳۰ء　جناب حمید اور رجسٹرار جامعہ عثمانیہ کے نام۔ خطبات کے سلسلے میں اقبال نے معذوری کا اظہار کیا۔
۵: ۲/مئی ۱۹۳۱ء　یہ تینوں خطوط سر اکبر حیدری کے نام ہیں جو اقبال نے مالی اعانت کے لیے
۶: ۱۴/مئی ۱۹۳۱ء　آفتاب اقبال کی درخواستوں کے سلسلہ میں سر اکبر حیدری کے خطوط کے جواب
۷: ۳/فروری ۱۹۳۸ء　میں لکھے تھے۔
۸: ۱۰/اکتوبر ۱۹۱۸ء　بنام علامہ عمادی
۹: ۳۱/اکتوبر ۱۹۱۸ء　بنام پروفیسر ابوظفر عبدالواحد
۱۰: ۲/مارچ ۱۹۳۵ء　بنام پروفیسر غلام دستگیر رشید

۱۱: ۱/نومبر ۱۹۳۵ء　　بنام ڈاکٹر سید عبداللطیف
۱۳/دسمبر ۱۹۳۵ء　　بنام ڈاکٹر سید عبداللطیف
۱۷/ستمبر ۱۹۳۷ء　　بنام ڈاکٹر سید عبداللطیف

بعض خطوط کے عکس اور تعلیقات بھی شامل ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر سید عبداللطیف، ''اقبال کا مسلکِ انسانیت'' اقبال ریویو، حیدرآباد دکن، اپریل ۲۰۰۶ء، ص ۷۵-۸۰

اقبال کی انسان دوستی اس کے کلام کا سرچشمہ ہے۔ کبھی کبھی تو یہ انسان دوستی اس قدر واضح دکھائی دیتی ہے کہ اسے تسلیم نہ کرنا شاعر کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اقبال چاہتے ہیں کہ انسانی زندگی خودداری کی بنیادوں پر کھڑی ہو اور اپنے آپ کو تنگ نظری، نسل پرستی اور قومی تفوق کے جذبے سے آزاد کرے۔

اقبال کا جذبہ انسانیت ان کا بنیادی نظریہ ہے۔ اقبال کی تحریروں میں مغرب کی تحریکات کے ساتھ ساتھ عیسائی اثرات اور ہندوستان اور قدیم ایران کے مسلکِ انسانیت کی جھلک ملتی ہے، لیکن جس جذبۂ انسانیت نے اقبال کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ جیسے مصلحینِ اعظم کا پیش کردہ، جنھوں نے رنگ و نسل اور ملک و قوم کی تفریق کی جڑ سے مٹا دیا اور عالم انسانیت میں ہم آہنگی پیدا فرمائی۔ اقبال بھی اس جذبۂ انسانیت پر بھروسا کرتے ہیں جو اسلام سے عبارت ہے۔

☆☆☆

سید امتیاز الدین، ''علامہ عمادی اور اقبال'' اقبال ریویو، حیدرآباد، اپریل ۲۰۰۶ء۔ ص ۱۹-۲۱

اقبال کے بارے میں علامہ عمادی کے مضامین دستیاب نہیں ہیں، لیکن بعض تحریروں اور خطوط سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان نہایت مخلصانہ روابط تھے اور دونوں ایک دوسرے کے قدردان تھے۔

مثنوی اسرارِ خودی شائع ہوئی تو مخالفین نے تنقیدی مضامین لکھنا شروع کر دیے۔ مولانا عمادی نے اقبال کے نقطۂ نظر کی تائید میں مضامین لکھے جو روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئے۔ اقبال کے انتقال پر ملال کی خبر سن کر علامہ عمادی نے ان کے مشہور فارسی قطعے کا اسی وقت قلم برداشتہ ترجمہ فرما دیا۔

علامہ اقبال	علامہ عمادی
سرود رفتہ باز آید کہ ناید	سرودِ دل نواز آئے نہ آئے
نسیمے از حجاز آید کہ ناید	پھر اب بوئے حجاز آئے نہ آئے
سر آمد روزگارے ایں فقیرے	زمانہ اس گدا کا ہوگیا ختم
دگر دانائے راز آید کہ ناید	کوئی دانائے راز آئے نہ آئے

☆☆☆

ڈاکٹر سید عبداللطیف: ''شاعر اقبال اور اس کا پیام'' اقبال ریویو، حیدرآباد دکن۔ اپریل ۲۰۰۶ء۔ ص ۸۱-۸۴

ڈاکٹر سچدانند سنہا نے اپنی ضخیم کتاب *The Poet and His Message* میں اقبال کی پوری زندگی، ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں کا عمومی جائزہ لیا ہے۔ جو قاری کو ڈاکٹر سنہا کے ذہن تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔ ڈاکٹر سنہا اس بات سے ناخوش ہیں کہ اقبال نے اردو کے بجائے فارسی کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ اس نقطۂ نظر کا اظہار انھوں نے بارہا کیا ہے جس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید وہ شاعر اقبال کے تعلق سے تعصّبات کا شکار ہے۔ ڈاکٹر سنہا کی تحقیق کا مقصد مثبت سے زیادہ منفی محسوس ہوتا ہے۔ مصنف نے نہایت تفصیل سے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ ''اقبال کیا نہیں ہیں'' بجائے اس کے ''اقبال کیا ہیں''۔ کتاب کے شروع سے آخر تک سچدانند سنہا ایک بت شکن کی طرح آمادہ پیکار نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سنہا نے اقبال کی پوری شخصیت اور فن کا کلی جائزہ لینے کی بجائے ان کا تجزیہ جزواً جزواً کیا ہے۔ اسی وجہ سے اقبال کی حقیقی تصویر ابھر کر ہمارے سامنے نہ آسکی۔

☆☆☆

پروفیسر ابوظفر عبدالواحد، ''اقبال کا شاعرانہ فلسفہ'' اقبال ریویو، حیدرآباد دکن، اپریل ۲۰۰۶ء۔ ص ۲۹-۳۷

اقبال نے شعر کو فلسفہ اور فلسفے کو شعر بنا دیا۔ فلسفے اور شعر کا جہاں خوش گوار امتزاج ہو، شعر جادو بن جاتا ہے۔ غالب کی شعریت فلسفے پر سدا غالب رہی۔ لیکن اقبال کی فلسفیت بعض اوقات شعریت پر غالب آجاتی ہے اور بحیثیت شاعر یہی اس کی کمزوری ہے۔

کوئی شاعر اپنے ماحول اور گردوپیش کے واقعات سے الگ تھلگ اور بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ جو کچھ وہ اپنے آس پاس دیکھتا ہے، اسے اپنی سرشت کے حساس سانچے میں ڈھال کر ایک خوبصورت اور دلکش انداز میں بیان کرتا ہے۔ اقبال کا ہندی ترانہ، نیا شوالہ اور تصویر، انھی تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ بحیثیت فلسفی انھوں نے اسلام کے اصولوں کو نظر کے سامنے رکھ کر، عالم گیر اخوت اور حیاتِ افراد کی ترقی اور تعمیر کا وہ انوکھا اصول تیار کیا جس کو نہ تو نطشے اور برگساں کے فلسفے سے براہِ راست کوئی تعلق ہے، جسے اقبال کے بعض یورپی ناقدوں نے دھڑلے کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس غلط فہمی کو خود اقبال نے اپنے ایک خط (بنام ڈاکٹر نکلسن) کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ علاوہ اس خط کے شاعر کی فارسی اور اردو تصانیف میں جابجا فلاسفہ مغرب کی تعلیمات سے بیزاری اور کم اعتقادی کا ثبوت ملتا ہے۔ اقبال فلسفی بھی تھا لیکن اس کے لیے یہ ایک اکتسابی چیز تھی۔ فلسفے کی رو میں وہ مدتوں بہتا رہا، اس کی شاعری کی عظمت اور بنا بھی فلسفے پر ہے تاہم فلسفہ علم ہے اور شاعری عشق۔ شاعری سے اسے عشق تھا اور اس کا عشق اس کی شاعری ہے۔ اسی سے اس نے سکون پایا اور اسی کے ذریعے اس نے اوروں کو سکون بخشا۔ وہ عمر بھر اپنے قناعت کدے میں دھونی رمائے، قلندرانہ زندگی بسر کرتا رہا اور اس رنگ کو مرتے دم تک نباہا۔

☆☆☆

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: ''کلامِ اقبال میں رجائیت'' آفاق، ٹورانٹو، جولائی ۲۰۰۶ء۔ ص ۳۲-۳۵

زندگی اہل احساس کے لیے المیہ اور اہل فکر کے لیے طربیہ ہوتی ہے۔ اقبال کو مبدأ فیاض سے حسّاس

دل کے ساتھ مفکرانہ ذہن اور قلندرانہ مزاج عطا ہوا تھا۔ اقبال کے نزدیک شاعر اور فن کار کا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے کمال فن سے دلوں میں نئی نئی آرزوئیں اور امنگیں بیدار کرے۔ اقبال حکیمِ حیات ہیں اور انسانی زندگی کی تکمیل کے لیے غم و آلام کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ غم ان کے نزدیک ایک تعمیری و تخلیقی قوت ہے، جس سے انسانی فطرت کے جوہر منکشف ہوتے اور جلا پاتے ہیں۔ جنگ عظیم اول کے بعد اقبال کی حکیمانہ بصیرت خضر راہ بن کر یہ پیغام دیتی ہے کہ تخریب کے یہ ہنگامے تعمیر نو کا پیش خیمہ ہیں۔ اقبال نے جبریت کے فلسفے اور قنوطیت کے سد باب کے لیے تقدیر کا ایک نیا تصور پیش کیا۔ اقبال کے نزدیک تقدیر کوئی اٹل فیصلہ نہیں، بلکہ مستقبل کا ایک کھلا امکان ہے۔

☆☆☆

ناصر عباس نیر: ''اقبال اور ہسے'' قومی زبان، کراچی، جون ۲۰۰۶ء۔ ص ۲۵-۳۴

ہرمان ہسے اقبال کے معاصر تھے۔ اقبال اور ہسے میں متعدد مشابہتیں اور مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ان دونوں کی نظر میں مشرقی تہذیب آفاقی ہے۔ ہسے اور اقبال کے فن کی اصل عشق میں پنہاں ہے۔ وہ عقل کو چراغِ راہ اور عشق کو منزل قرار دیتے ہیں اور دونوں نے یہ تصور غالباً مولانا روم سے اخذ کیا ہے۔ اقبال اور ہسے دونوں متقدمین مشرق سے اثر اندوزی، طلب، تشنگی اور عقیدت میں بھی برابر ہیں۔ جاوید نامہ میں اقبال جن اصحاب کرام کی عنایتوں کے شکر گزار ہیں، ہسے بھی انھیں کے مداح ہیں۔ اقبال علم کے لیے ''خبر'' اور ''نظر'' کی اصطلاح لائے۔ دونوں کے خیال میں علم وہی درست ہے جو عقل اور عشق دونوں کا حسین امتزاج ہو اور ایسے ہی علم پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں مولانا روم کی پیروی میں صرف عقل کے تابع زندگی کو ظلمانی اور شیطانی، جب کہ عشق کے تابع زندگی کو الوہی اور نورانی قرار دیتے ہیں۔ اقبال اور ہسے کی مشرق و مغرب کے فلسفے، دین، تاریخ، تصوف اور روایت پر خصوصی گہری نظر تھی۔ دونوں اپنی تاریخ اور روایت کے بڑے پاسدار تھے۔

ان فکری اور فنی یکسانیوں کے علاوہ اقبال اور ہسے میں حیران کن حد تک داخلی، خانگی اور نجی نوعیت کی مشابہتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کا پرتو نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد رفیع الدین: ''خودی اور آرٹ'' آفاق، اگست ۲۰۰۶ء۔ ص ۳۲-۳۵

فعلِ جمیل سے اقبال کا مطلب ایسا فعل ہے جو اپنے مقصد کے لحاظ سے حسین ہو یعنی جس کا مقصد خودی کے کامل نصب العین یا صحیح تصورِ حقیقت سے ماخوذ ہو اور صفات حسن کے مطابق ہو۔ خودی کی فطرت اس قسم کی ہے کہ انسان کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس کو وہ معنوی طور پر ہی نہیں بلکہ ظاہری طور پر بھی خوبصورت بنانے کی کوشش نہ کرے۔

خودی اور آرٹ کے ضمن میں ثقافت اور تہذیب کا فرق، حسن کے پہلوؤں، صداقت اور نیکی، خدا کی آرزو اور آرٹ کا تعلق اور آرٹ کی خطرناک قسموں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔